انکشاف

افتخار مغل

انکشاف

(شاعری)

افتخار مغل

کتاب: انکشاف (شاعری)
اہتمام: منصورہ احمد (اساطیر)
سرورق: استاد اللہ بخش
کمپوزنگ: اسد المعظم، مظفر آباد، آزاد کشمیر
لیزر کمپوزنگ اِن، ۵-رائل پارک، لاہور
مطبع: طیبہ پرنٹرز، ۶۲-چیمبرلین روڈ، لاہور
تعداد: ایک ہزار
سنہ اشاعت: ۲۰۰۳ء
قیمت: ۲۲۰ روپے

اساطیر
۴۵-اے، مزنگ روڈ، لاہور
فون: ۶۳۰۴۸۲۰

محبت

اور

محبت کے دیوتا

احمد ندیم قاسمی

کے نام

ہر اک محبوب میں تُو تھا، سو ہم نے
بہت اخلاص سے کی ہر محبت

سپاس

 منصورہ احمد

آپ کا شکریہ، کے آپ نے مجھے ''انکشاف'' کا حوصلہ بخشا!

 پروفیسر میاں محمود احمد

تمھارا احسان، کہ تم میری ہر کتاب کی کمپوزنگ میں اتنی جان کھپاتے ہو کہ مجھے تم پر ترس آنے لگتا ہے۔

 صبا قمر

خدا تجھے سلامت رکھے کہ میرا کوئی بھی علمی تحقیقی اور تخلیقی کام ترے بغیر مکمل نہیں ہوتا۔

 اسدالمعظم مُغل

زندہ باد، کہ میرے بہن بھائیوں میں تم نے میری شاعری کے ساتھ سب سے بڑھ کر محبت کی —— اور اس مجموعے کے لیے محنت بھی!

 شوکت راجا (اقبال مصوّر)

تم جیو! کہ تمھارے جیسے اخلاص مند شاگرد ہوں تو بکھرے ہوئے حرف آسانی سے جڑ سکتے ہیں۔



احمد حسین مجاہد/آمنہ بہار رُونا

خدا آپ کے حرف میں برکت دے کہ آپ دونوں نے مجھے "شعروں کے انتخاب" میں "رسوا" ہونے سے بچا لیا!



فیصل، گڑیا، مُنی، ببلی، علی، حرا، پنکی، نینی، روزی، عسری اور عکسی!

آپ سب مجھے معاف رکھنا، کہ میں نے آپ لوگوں کا وقت ان حرفوں کو دیا ہے۔



نسرین افتخار

بہ جز حکایتِ تو ایں وجود چیزے نیست



والد محترم!

خدا آپ کا سایہ سلامت رکھے کہ میری جرأت اظہار کے سارے سوتے آپ کے وجود سے پھوٹتے ہیں۔

اور



بے جی!

آپ کی یادوں کے صدقے! کہ آپ میری ماں نہ ہوتیں تو میں شاعر نہ ہوتا

میں کُل کا کُل ترا قصہ، میں سب کا سب تری یاد

آپ سب کا

افتخار



لہو کو شعر بنا لیں تو اس کی باتیں ہوں
بیاضِ زخم نکالیں تو اس کی باتیں ہوں

وہ خود جگے مرے شعروں میں جوت بن کے کبھی
نہ یہ کہ جوت جگا لیں تو اس کی باتیں ہوں

ڈھلے تو آپ ڈھلے سوچ کے پیالوں میں
یہ کیا کہ ہم اُسے ڈھالیں تو اس کی باتیں ہوں

ذرا فراغ! کہ موسم کُھلے تو بات کُھلے
گھٹائیں گیسو سُکھا لیں تو اس کی باتیں ہوں

کچھ اہتمام! کہ قصہِ ہے اک پری وش کا!
کہ رنگ، رنگ جما لیں تو اس کی باتیں ہوں

چراغِ اشک فروزاں کریں سرِ مژگاں
ذرا یہ دِیپ جلا لیں تو اس کی باتیں ہوں

جب اس کی بات چلے پھر نہ کوئی بات چلے
زمانے وقت نکالیں تو اس کی باتیں ہوں

بہت چلے گا ' چلے گا جو اس کا ذکرِ جمیل
قیامتوں کو سُلا لیں تو اس کی باتیں ہوں

غمِ حیات ، غمِ روزگار ، فِکرِ معاش
گر اِن بلاؤں کو ٹالیں تو اس کی باتیں ہوں

نئے چراغ حوالوں کے ، ہاتھ سے رکھ دیں
کوئی پرُانا دیا لیں تو اس کی باتیں ہوں

اب اُس جمال کا سورج نکلنے والا ہے
ذرا چراغ بُجھالیں تو اس کی باتیں ہوں

ذرا سنور لے عروسِ زبانِ فتنہ گری
فسانے بال بنا لیں تو اس کی باتیں ہوں

وہ رم کرے تو غزل شعر شعر چلتی ہے
بیان لہجے غزالیں تو اس کی باتیں ہوں

یہ فکرِ خام! کہ جیسے خزاں کی بکھی شفق
اسے لہو میں تپا لیں تو اس کی باتیں ہوں

ابھی کہاں وہ سلیقہ کہ اس کی بات سجے
جو خود کو میرؔ بنا لیں تو اس کی باتیں ہوں

جمال دوست ہیں ہم بھی مگر ولی تو نہیں
ولیؔ کی طرز اڑا لیں تو اس کی باتیں ہوں

وہ حبسِ نظم و رباعی میں کب کھلے اے دل
رہِ غزل کی ہوا لیں تو اُس کی باتیں ہوں

ادھر سے گزریں تو مل جائیں میر و غالب سے
ذرا بڑوں کی دُعا لیں تو اس کی باتیں ہوں

وہ کم سپرد غزل بیچ بھی کھلے کم کم
بس اُس کو اُس سے چُرا لیں تو اُس کی باتیں ہوں

خود اس کا ذکر ہے دیوانِ حافظِ شیراز
سخن کی فال نکالیں تو اس کی باتیں ہوں

نہیں کہ اس سا کوئی دوسرا بھی ممکن ہے
یہ وہم دل سے نکالیں تو اس کی باتیں ہوں

وہ بیچ آئے تو تہوار کی طرح آئے
نوائیں رنگ اچھالیں تو اس کی باتیں ہوں

کہ اس کی آنکھ، شرابوں کا استعارہ ہے
خراب جام اٹھا لیں تو اس کی باتیں ہوں

مزہ تو جب ہے کہ شب زندہ دار، سجدہ گزار
غرورِ زہد، بچا لیں تو اس کی باتیں ہوں

کوئی بہک کے قدم کیوں اٹھائے! حدِ ادب!
ہوائیں خود کو سنبھالیں تو اس کی باتیں ہوں

گلہ نہ ہو کہ کوئی سو تارہ گیا امشب
عروسِ شب کو جگا لیں تو اس کی باتیں ہوں

کوئی قرینہ نہیں اس کے ذکر کا، لیکن
اسے بہانہ بنا لیں تو اس کی باتیں ہوں





اک خلا ، ایک لا انتہا اور میں
کتنے تنہا ہیں میرا خدا اور میں

کتنے نزدیک اور کس قدر اجنبی!!
مجھ میں مجھ سا کوئی دوسرا اور میں

لوگ بھی سو گئے ، روگ بھی سو گئے
جاگتے ہیں مرا رت جگہ اور میں

رات اور رات میں گونجتی ایک بات
ایک خوف، اک منڈیر، اک دیا اور میں

شہر تاراج ہے ، جبر کا راج ہے
پھر بھی ثابت ہیں میری انا اور میں

تیرے موسم ، تری گفتگو اور تو
میری آنکھوں میں اک ان کہا، اور میں!

اب تو اس جنگ کا فیصلہ ہو کوئی
لڑ رہے ہیں ازل سے ہوا اور میں

"رنگ، خوشبو، شفق، چاندنی، شاعری..."
لکھ رہا تھا میں، اس نے کہا" اور میں!"

اس کی بات اور ہے ، ورنہ اے افتخار
اس کو معلوم ہے ، التجا اور میں!!

☆

○

جمال گاہِ تغزّل کی تاب و تب تری یاد
پہ تنگنائے غزل میں سمائے کب تری یاد

کسی کھنڈر سے گُزرتی ہوا کا نم! ترا غم!!
شجر پہ گرتی ہُوئی برف کا طرب تری یاد

تُو مجھ سے میرے زمانوں کا پوچھتی ہے تو سُن!
ترا جنوں ، ترا سودا ، تری طلب ، تری یاد

گُزر گہوں کو اُجڑنے نہیں دیا تو نے
کبھی یہاں سے گزرتی تھی تُو ، اور اَب تری یاد

بہ قیدِ عمر تو کتنی نظر نہیں آتی!
بس اک قرینہ! ترا دھیان ، ایک ڈھب! تری یاد

بہ فیضِ دردِ محبت میں خوش نسب ، میں نجیب!
مرا قبیلہ ترا غم ، مرا نسب تری یاد

بہ جز حکایتِ تو ایں وجود چیزے نیست
میں کُل کا کُل ترا قصہ میں سب کا سب تری یاد

دریں گمان کدہ کُلُّ مَنْ عَلَیْہَا فَانٍ
بس اک چھلاوہ مرا عشق ، ایک چھب تری یاد

بہر سبیل ہُنر کا سفر تو جاری ہے
کبھی کچھ اور بہانہ ، کبھو سبب تری یاد

☆



کسی سبب سے اگر بولتا نہیں ہوں میں
تو یوں نہیں کہ تجھے سوچتا نہیں ہوں میں

میں تم کو خود سے جدا کر کے کس طرح دیکھوں
کہ میں بھی "تم" ہوں، کوئی دوسرا نہیں ہوں میں

تو یہ بھی طے ! کہ بچھڑ کر بھی لوگ جیتے ہیں
میں جی رہا ہوں! اگرچہ جیا نہیں ہوں میں

کسی میں کوئی بڑا پن مجھے دکھائی نہ دے
خدا کا شکر کہ اتنا بڑا نہیں ہوں میں

مری اٹھان کی ہر اینٹ میں نے رکھی ہے
میں خود بنا ہوں! بنایا ہوا نہیں ہوں میں

یہاں جو آئے گا وہ خود کو ہار جائے گا
قمار خانۂ جاں میں نیا نہیں ہوں میں

مرے وجود کے اندر مجھے تلاش نہ کر
کہ اس مکان میں اکثر رہا نہیں ہوں میں

میں ایک عمر سے خود کو تلاشتا ہوں مگر
مجھے یقین نہیں، ہوں بھی یا نہیں ہوں میں

میں اک گمان کا امکاں ہوں افتخار مغل
کہ ہو تو سکتا ہوں لیکن ہوا نہیں ہوں میں





الٹ گئی تری کشتی تو کیا خطا مری دوست
نہ موج میری طرف دار، نے ہوا مری دوست

بصد ہنروری سونے میں ڈھالتی ہے تجھے
یہ میری شاعری، یعنی یہ کیمیا مری دوست

ترے سوا بھی مرے غمگسار ہیں تو سہی!
کہ رات میری عزادار اور صبا مری دوست

ہم اہلِ ہجر کا کیا ہے، جیے تو جی لیں گے
خدا دراز کرے تیری عُمر جا، مری دوست

اسی زباں سے تجھے بے وفا کہوں کیسے
اسی زبان سے میں نے تجھے کہا ''مری دوست''

یہ زندگی ہے، یہاں سو طرح کے قصّے ہیں
کسی کے دوست نہ رہنے کا کیا گلہ مری دوست

یہ ہجر دوست کٹھن ہے یہ قیدِ عمر، مگر
میں کاٹ لوں گا کسی طور یہ سزا، مری دوست

بچھڑ کے تجھ سے میں زندہ رہا؟ نہیں مری جان
مرا نہیں ہوں ترے ہجر میں، بجا مری دوست

تمھارا عشق بھی کھینچا، غمِ جہاں بھی سہا
یہ بوجھ ڈھوئے ہیں میں نے جدا جدا، مری دوست





یہ جو اک ڈولتا ستارہ ہے!
یہ مرا، آپ کا، ستارہ ہے

دل بھی ہے ایک نوع کی دُنیا!
یہ بھی ٹُوٹتا ہوا ستارہ ہے

کون یوں جاگتا ہے رات گئے
میں ہوں یا صبح کا ستارہ ہے

اک مسلسل شکستگی ہے حیات
زیست اک ٹُوٹتا ستارہ ہے

آنکھ کی جھیل میں نہ چمکا، جو
وہ ستارہ بھی کیا ستارہ ہے

میری مٹی بھی کہکشاں کا غبار
میری بھی کیمیا ستارہ ہے

ابھی ٹُوٹا تھا اک ستارۂ اشک
پھر مژہ پر نیا ستارہ تھا

اپنا اپنا ہے آسماں سب کا
ہر کسی کا جُدا ستارہ ہے

تب ترا روپ چڑھتا سورج تھا
اور اب ڈُوبتا ستارہ ہے





رکھ رکھاؤ میں کوئی خوار نہیں ہوتا یار
دوست ہوتے ہیں، ہر اک یار نہیں ہوتا یار

یار! یہ ہجر کا غم! اس سے تو موت اچھی ہے
جاں سے یُوں ہی کوئی بے زار نہیں ہوتا یار

رُوح سُنتی ہے محبت میں بدن بولتے ہیں
لفظ پیرایۂ گُفتار نہیں ہوتا یار

نوکری، شاعری، گھر بار، زمانہ، قدریں
اک محبت ہی کا آزار نہیں ہوتا یار

خوش دلی اور ہے اور عشق کا آزار کچھ اور
پیار ہو جائے تو اقرار نہیں ہوتا یار

لڑکیاں لفظ کی تصویر چھپا لیتی ہیں
ان کا اظہار بھی اظہار نہیں ہوتا یار

آدمی عشق میں بھی خود سے نہیں گھٹ سکتا
آدمی سایۂ دیوار نہیں ہوتا یار

گھیر لیتی ہے کوئی زُلف، کوئی بُوئے بدن
جان کر کوئی گرفتار نہیں ہوتا یار

یہی ہم آپ ہیں ہستی کی کہانی، اس میں
کوئی افسانوی کردار نہیں ہوتا یار





اک رُخ پہ مرا دیدۂ حیران کُھلا ہے
لگتا ہے کہیں رحل پہ قرآن کُھلا ہے

غم دوست سی لڑکی سے رہ و رسم چلی ہے
یا میر تقی میرؔ کا دیوان کُھلا ہے

اک خواب کی میّت پئے تدفین اُٹھی ہے
تب جا کے کہیں رات کا زندان کُھلا ہے

آثار سے لگتا ہے کہ ممکن ہے خدا ہو!
دل میں اسی باعث درِ امکان کُھلا ہے

یہ زیست بھی ساقیؔ☆ کی کوئی نظم ہے شاید
سو رنگ سے اس نظم کا عنوان کُھلا ہے

ہستی کو سمجھنے میں بڑا وقت لگا ہے
اک عمر میں مُجھ پر مرا مہمان کُھلا ہے

کُچھ خواب ہیں، کُچھ شعر ہیں، کُچھ درد ہیں، کُچھ داغ
بکھرے میں بہ ہر سُو مرا سامان کُھلا ہے

کس خاک پہ کُھلنے تھے مری خاک کے جوہر
یہ بستۂ صد رنگ کہاں آن کُھلا ہے

مدت ہوئی تلخابِ خموشی سے بہلتے
تب لذّتِ گُفتار کا جُزدان کُھلا ہے

☆

☆ ساقی فاروقی

○

خزاں میں پھول کھلے تھے بہار کے جیسے
پہ خال خال تھے تجھ سے نگار کے جیسے

نہیں ہے درد کوئی دردِ ہجر سا، لیکن!
بہت سے غم ہیں، غمِ روزگار کے جیسے

اس عہدِ مرگِ صدا میں یہ شعر، یہ مصرعے
سکوتِ دشت میں صوتِ ہزار کے جیسے

قبائے مرگ بھی اک دن اُتار پھینکیں گے
لبادِ ہست چلے ہیں اُتار کے جیسے

ق

پھر ایک بار کھڑے ہیں ملول و لب بستہ
مزارِ وقت پہ اوجِ مزار کے جیسے

پھر ایک بار وہی رہگزارِ غم، وہی ہم
دیارِ جاں میں غریب الدیار کے جیسے

پھر ایک مرتبہ خود کو سمیٹ لیں تو چلیں
پھر ایک بار اُڑے ہیں غبار کے جیسے

وفا خصال بڑے لوگ تھے، پہ کم کم تھے
ترے قتیل، ترے افتخار کے جیسے





کبھی فساد ہیں تن میں لہو کے ہونے سے
بلا کا شور ہے اس آب جُو کے ہونے سے

یہ دل کا روگ، یہ آنکھوں میں انتظار، یہ خواب
کئی عذاب ہیں اک آرزو کے ہونے سے

پُر انتشار بھی ہے جسم کا بھرا بازار
تو رونقیں بھی اسی ہاؤ ہو کے ہونے سے

بس اک جہت تھی، محبت کی اک جہت، ورنہ
غرض نہیں تھی ہمیں ہشت سُو کے ہونے سے

سرائے جاں کے اندھیروں میں کس کو ہونا تھا
مگر یہ بات! کہ اک شعلہ رُو کے ہونے سے

مکالمے سے تو ابلاغ ٹوٹ جاتا ہے
نہ ہونا اچھا رہا گفتگو کے ہونے سے

یہ چار شعر حوالہ ہیں میرے ہونے کا!
اگر میں ہوں تو اسی آبرو کے ہونے سے

یہ چھب، یہ رُوپ، یہ پَل! رفتنی ہیں سب چیزیں
غنی نہیں ہے کوئی رنگ و بُو کے ہونے سے



○

اب کہاں شہر میں وہ آئنہ تن تم جیسے
لے گئے باندھ کے سب رُوپ کا دھن، تم، جیسے

ہم نے کھینچے تو یہ ہم تھے، سو یہ غم کھینچے ہیں
کھینچ سکتے نہیں یہ رنج و محن تم جیسے

ہم بھی جی لیں گے کسی طور بہ ایں حالِ فراق
ہم نے بھی سیکھ لیے تم سے چلن تم جیسے

ہم میں قوت ہے بچھڑ جانے کی، ہم ہجر نصیب
ہار آئے ہیں کئی لعلِ یمن تم جیسے

کبھی لگتا ہے کہ تم سرو سمن جیسے ہو
کبھی لگتا ہے کہ ہیں سرو سمن تم جیسے

ہم سا مداح بھی لاکھوں میں کوئی ہوتا ہے
شاذ ہوتے ہیں اگر زہرہ بدن تم جیسے

تب تلک سبز ہے یہ برگِ غزل، جب تک ہیں
ہم سے آشفتہ بیاں، رشکِ چمن تم جیسے

کون لکھے ترے مصرعے پہ غزل تجھ سی فراز
"کوئی کس منہ سے کرے تم سے سخن تم جیسے"☆

☆

☆ احمد فراز

○

ہوس نے پوچھا، یقیں کا دیا بچا کہ، بُجھا؟
کہا "بُجھا پہ تری شُعلگی بُجھا کے بُجھا"

ہوا کا نظم و نسق اور میں اکیلا چراغ
اور اس پہ بھی مرے لوگوں کو یہ گلہ کہ بُجھا!

دیے بجھا دیے خواہش کے ایک اک کر کے
یہ اک چراغِ نفس ہے سو یہ بُجھا کہ بُجھا

وہ رہ گزر پہ رکھا دیپ تھا سو بُجھنا تھا
پر اپنے جیسے ہزاروں دیے جلا کے بُجھا

اک آئنے کی چمک تھی، ترے ہمارے بیچ
وہ سلسلہ کہ جو ٹوٹا! وہ آئنہ کہ بُجھا!

ترے خیال کی لو تو نہیں لرزنے دی
ہمارے شعلے کا کیا ذکر وہ رہا کہ بُجھا

شرارِ ہست تھا کوئی سو جل بُجھا یکبار
کوئی چراغِ لحد تھا سو لڑکھڑا کے بُجھا

میں اک شہابِ شکستہ تھا افتخارؔ مغل
بُجھا ضرور، مگر خُوب جگمگا کے بُجھا



○

مری طرح سے خدا اُس کو بے مزا نہ رکھے
یہ مطمئن بھی بچھڑ کر اُسے خُدا نہ رکھے

جلا کے رکھے دُعا کے چراغ پلکوں پر
فقیر وہ ہے جو لفظوں میں مدعا نہ رکھے

تو سر کا بوجھ بھلا کس لیے اُٹھا کے پھرے
جس کے سر میں خدا عشق کی ہوا نہ رکھے

وہ دھان پان سی لڑکی رکھے گی پاسِ وفا
سنبھال کر جو بدن پر کبھی رِدا نہ رکھے

نکال کر جو ہتھیلی پہ اپنا دل رکھ دے
پسِ سکوت وہی قبر پر دیا نہ رکھے

میں ابنِ ارض ہوں میرا نسب مری مٹی
جو خاک زاد نہیں مجھ سے سلسلہ نہ رکھے

خدا کسی پہ نہ لائے یہ وقت ، ہجر کا وقت
ہمارے بعد کسی کو خُدا جُدا نہ رکھے

وہی رکھے درِ ثاقب☆ سے افتخار نیاز
جو شخص اپنی طبیعت قلندرانہ رکھے

☆

☆آصف ثاقب



جو اُس نے ٹھان لی وہ کر گیا تو؟
مرا بیٹا بھی گر مجھ پر گیا تو؟

میں کس شدت سے اُس کو سوچتا ہوں
وہ میری شدتوں سے ڈر گیا تو؟

کسی دن چلتے چلتے کاسۂ سر
تری دہلیز پر میں دھر گیا تو؟

ابھی ہے عشق خطرے کے نشاں تک
یہ سیلاب اور بھی اُوپر گیا تو؟

ہوا مجھ پر ہنسے گی اس دفعہ بھی
میں دستک پر اگر باہر گیا تو

یہ دُنیا تو گئی اُس کے جنوں میں
اور اب کے اُس کا سنگِ در گیا تو!

مجھے بس اک ہنر آیا محبت!
محبت سے بھی گر دل بھر گیا تو؟

نہ سویا ہوں نہ رویا ہوں بچھڑ کر
اگر میں ضبطِ غم سے مر گیا، تو؟





جو میرے برج میں رُکتا کہیں مرا سورج
تو میں دکھاتا زمانے کو دوسرا سورج

شفق مثال چمکتا ہے تیری چھت کا اُفق
یہیں کہیں تھا ابھی تیرے حسن کا سورج

تری جدائی کا عالم ابھی نہیں بھولا
ابھی بھی دِکھتا ہے ساحل سے ڈُوبتا سورج

یہ تیرے نام میں کیا دھوپ سی ہے، جب بھی لیا
مجھے لگا ہے کہ مجھ میں اُتر گیا سورج

تو کائنات! یہی کائنات ہے تیری!
تھکے تھکے سے ستارے! بُجھا بُجھا سورج!

یہ میرا جُرم بھی ہے اور میرا فخر بھی ہے
ویسے کو میں نے کبھی بھی نہیں کہا ”سورج“

کہ اک زمانے سے سُونا ہے دار کا منظر
تہاڑ جیل☆ پکارے ”کوئی نیا سورج“

ہر اک زمین غزل کی زمین لگتی ہے
مری زمیں پہ چمکتا ہے جب ترا سورج

☆

☆ تہاڑ جیل: جہاں قائدِ حریتِ کشمیر مقبول بٹ شہید کو پھانسی دی گئی اور بعد میں اسی جیل میں دفن کیا گیا۔

○

یہ کچھ دنوں کی نہیں بات اک دہائی کی ہے
بڑی طویل کتھا اُس سے آشنائی کی ہے

یہ لڑکیوں کے جواں قہقہے، یہ گیت، یہ شعر
انہی نواؤں سے برکت نوا سرائی کی ہے

اس عہدِ مرگِ محبت کا المیہ یہ ہے
وہی ہے عمر محبت کی جو پڑھائی کی ہے

مجھے تک اپنی دُعا دیجیے میر صاحب جی!
مرے بھی سر میں ہوا عشق و آشنائی کی ہے

وہ یُوں بھی قہر ہے اپنی اداؤں میں، اور پھر
ستم ظریف کو عادت بھی خود ستائی کی ہے

یہ ایک شام نہیں کٹ رہی کسی صورت
ابھی تو عُمر ہے اور عُمر بھی جدائی کی ہے

ہمارے ہاتھ سے نکلی ہیں تتلیاں کئی بار
ہماری تربیت بچپن سے نارسائی کی ہے

کہاں چھپائے گا تو افتخار اپنوں سے
جو تیری رُوح میں خوشبو کسی پرائی کی ہے



○

وہ تیرے ہجر کی یادیں ، ترے وصال کی رَو
یہ کیسے پھر گئی ماضی کی سمت حال کی رَو

مرے جنوں کی یہ حالت نہیں رہے گی ، جو ہے
پہ کتنے روز رہے گی ترے جمال کی رَو؟

وہاں پہ تیرے حوالوں کے پھول سوکھ گئے!
پہنچ گئی ہے کہاں تُو ، مرے خیال کی رَو!

سنا ہے اب ترے گالوں کی لَو بھی مدھم ہے
گزر گئی ہے یہاں سے بھی اک زوال کی رَو

تمھارے دھیان کی رَو سے نکل کے جب دیکھا
نکل گئی تھی بہت دُور ماہِ وصال کی رَو

مُجھی پہ رہنے دو الزام ، تم کہو گے کیا
تمھاری سمت اگر مُڑ گئی سوال کی رَو؟

یہ بحر ، بحرِ متقارب ہے افتخار مغل
کوئی شبیہہ کا موجہ! کوئی خیال کی رَو!

☆



کہیں سے ٹوٹ گیا ہے وہ سلسلہ مری جاں
ہمارے بیچ تو کچھ بھی نہیں رہا مری جاں

شکستِ زعمِ تعلق کے بعد بھی دل میں
جہاں پہ تُو تھا وہاں پر ہے اک خلا مری جاں

ابھی زبان پہ ہے تیری گفتگو کا لمس
ابھی تو ہاتھ میں ہے تیرا ذائقہ مری جاں

یہ میرے شعر، جو سونے کے مول اٹھتے ہیں
تری نگاہ ہے اس زر کی کیمیا مری جاں

تجھے میں کیسے بتاؤں کہ تو ہے میرے لیے
مری ہتھیلی پہ رکھی ہوئی دعا مری جاں

بہت سے باب ہیں آنکھوں میں ناکشودہ ابھی
میں تجھ پہ پوری طرح سے نہیں کھلا مری جاں

"مگر یہ بھید بڑی دیر میں کھلا مجھ پر"☆
وہ انکشاف کا لمحہ تھا واہمہ مری جاں

☆

☆احمد حسین مجاہد



تمام عمر رہا رابطہ ہمارے بیچ
پہ سدِ راہ رہی ہے انا ہمارے بیچ

ہم ایک ہوتے ہوئے خود کو دو سمجھتے رہے
یہ کس نے رکھ دیا تھا آئنہ ہمارے بیچ

یہ ہم تھے! یا کسی حدِ متارکہ کی سپہ
بنا نہیں ہے کبھی راستہ ہمارے بیچ

بجز ملالِ مسافت گرہ میں خاک نہیں
بجز غبارِ سفر کچھ نہ تھا ہمارے بیچ

ہزار شامیں گزاری ہیں گفتگو میں، مگر
کبھی کھلا نہیں وہ اَن کہا ہمارے بیچ

یہ ٹھیک ہے کہ جلا بھی نہیں قرینے سے
مگر بجھا بھی نہیں ہے دیا ہمارے بیچ

ہم ایک دوسرے کا دکھ ہیں افتخار مغل
تمام عمر یہی طے رہا ہمارے بیچ





آپ خنجر بنوں اور آپ ہی گھائل ہو جاؤں
زہر بھی آپ بنوں، آپ ہی زائل ہو جاؤں

گھنگرو بن کے بجوں تیرے ہر اک گام پہ میں
تُو جو کہہ دے تو ترے پاؤں کی پائل ہو جاؤں

یہ بھی ہو سکتا ہے میں مانگ لوں تجھ کو تجھ سے
یہ بھی ہو سکتا ہے اک روز میں سائل ہو جاؤں

شام بن کر میں اُتر آؤں دریچے سے ترے
بن کے خوشبو میں تری راہ میں حائل ہو جاؤں

زندگی! تُو مجھے قائل تو نہیں کر پائی
تُو اگر اس سے ملا دے تو میں قائل ہو جاؤں

عین ممکن کہ میں ہو جاؤں سراسر تجھ سا
عین ممکن ہے کہ میں خود پہ ہی مائل ہو جاؤں

میں محبت ہوں، محبت کا اثر ہوں اے دوست
یہ تو ممکن ہی نہیں ہے کہ میں زائل ہو جاؤں

☆



کوئی چٹان، چٹختی ہے جب چٹانوں میں
تو ایک ہُوک سی اُٹھتی ہے سخت جانوں میں

بہت سے لوگ ہوئے رزقِ رہ گزارِ غزل
بہت سے لوگ تھے لیلیٰ کے سار بانوں میں

یہ کن کے جسم اٹھائے ہوئے ہیں، میں اور تُو؟
یہ کون اجنبی ہیں میری، تیری جانوں میں؟

ولی ہو میر تقی ہو کہ مصحفی کہ انیس
عجیب طرح کے افسوں ہیں ان فسانوں میں

کہیں کہیں پہ ہجرت بھی کر رہے ہیں لوگ
کہیں کہیں پہ کوئی گھر بھی ہے مکانوں میں

ہزار پھیر ہیں دریائے ہست کی رہ میں
ہزار موڑ ہیں ہونے کی داستانوں میں

تو کیا طلسم تھا؟ اس روز افتخارِ مغل!
وہ بولتی تو کھنکتے تھے لفظ کانوں میں



○

حبس میں ایک درِ باز بنا رکھا ہے
حرفِ خاموش کو آواز بنا رکھا ہے

تُو نے جس شخص کو سمجھا تھا فقط گرد و غبار
اس نے اب تک تجھے دمساز بنا رکھا ہے

اس کی پلکیں بھی نہیں لرزیں کبھی اس کے لیے
ہم نے جس عشق کو اعزاز بنا رکھا ہے

داغِ رسوائی! ترا شکر! کہ جس نے مجھ کو
خلقتِ شہر میں ممتاز بنا رکھا ہے

رُوح کی رُوح تلک مجھ پہ ہویدا ہے وہ شخص
خود کو جس شخص نے اک راز بنا رکھا ہے

میں ترے خواب کی تصویر بھی لے سکتا ہوں
نیند میں تُو نے وہ انداز بنا رکھا ہے

مختصر یہ کہ وضاحت نہیں مسلک اپنا
ہم نے ایجاز کو اعجاز بنا رکھا ہے

☆

○

محبتوں کا نتیجہ دِکھائی دیتا ہے
یہ خواب مجھ کو اُدھورا دِکھائی دیتا ہے

اُسے یہ کون بتائے کہ اس کا رنگِ شکست
اُدھورے خط میں بھی پُورا دِکھائی دیتا ہے

میں جب بھی عشق کا انجام سوچتا ہوں، مجھے
ہمیشہ خواب میں صحرا دِکھائی دیتا ہے

کبھی کبھار چمکتا ہے شعروں میں کوئی شعر
کبھی کبھی یہ ستارا دکھائی دیتا ہے

عجب طلسم ہے! جس شے کو غور سے دیکھوں
اسی میں اس کا سراپا دکھائی دیتا ہے

شکستہ لوگ بھی ہوتے ہیں ٹوٹے آئینے
ان آئنوں میں تماشا دکھائی دیتا ہے

اُسے بھی نیند نہیں آتی افتخار مغل
مجھے بھی اس کا دریچہ دکھائی دیتا ہے

☆

⊙

بلا سے دوستو! جینا محال ہو جائے
امیرِ شہر سے تو اِک سوال ہو جائے!

یہ شاعری، یہ ریاضت کوئی مذاق ہے کیا؟
کہ جو بھی چاہے، وہی خوش خیال ہو جائے

کوئی طلسم کدہ ہے یہ کُنجِ یادِ یار
جو اس میں بیٹھ کے رو لے، نہال ہو جائے

وہ تیرے وصل کی بارش، وہ تیرے رُوپ کی دھوپ
کمال ہو جو وہ موسم بحال ہو جائے

کسے فراغ کہ ناپے محیطِ عرصۂ عمر
کسے دماغ! بکُلِ ماہ و سال ہو جائے

خیال میں تو رمیدہ ہے کب سے اک خوش چشم
غزل میں قید اگر وہ غزال ہو جائے!

وہ بے نیاز جو چاہے تو افتخارِ مغل
نہیں بعید کہ تُو لازوال ہو جائے





غمِ حیات پہ انسان رو بھی سکتا ہے
اور اس کی چھاؤں میں چاہے تو سو بھی سکتا ہے

ہوائے نیم شبی ہے گئے دنوں کا خیال
سو اس کا نم ہری آنکھیں بھگو بھی سکتا ہے

یہ خد و خال کا اندوختہ، یہ نقدِ جمال
یہ مال وقت کے میلے میں کھو بھی سکتا ہے

ہمیں دماغ کہاں بارِ جسم کا، ورنہ
یہ بوجھ آدمی چاہے تو ڈھو بھی سکتا ہے

کوئی لپیٹ بھی تو سکتا ہے تیرے داماں سے
یہ حادثہ ترے ہونے سے ہو بھی سکتا ہے

اس انکشاف نے حیران کر دیا کہ وہ شخص
سوالِ ترکِ تعلق پہ رو بھی سکتا ہے

میں اس کو بھول بھی سکتا ہوں [illegible] مغل
زمانہ داغِ جدائی کو دھو بھی سکتا ہے

☆☆



جو کبھی آنکھ کو جل تھل نہیں ہونے دیتا
وہ کہانی بھی مکمل نہیں ہونے دیتا

شانت رکھتا ہے دل و جاں کو محبت کا سُرور
عشق انسان کو بوجھل نہیں ہونے دیتا

تُو کسی آنکھ کا مرکز ہو، کسی دل کا سُرور
میں تجھے جان سے اوجھل نہیں ہونے دیتا

شاعری مجلسِ ہستی میں ہے رَوزن کی طرح
یہ ہُنر حبس میں پاگل نہیں ہونے دیتا

اور کیا چاہتے ہیں لوگ وفاداروں سے
پیار خوابوں کو معطّل نہیں ہونے دیتا

مسلکِ غم کا پیمبر ہوں میں اور میرا خُدا
مجھ پہ یہ دین مکمل نہیں ہونے دیتا

اُس کو اُلجھی ہوئی چیزوں سے بہت رغبت ہے
وہ مرے مسئلوں کو حل نہیں ہونے دیتا



○

باعثِ ترکِ تعلق جو بھی تھا ، اپنی جگہ
جل رہا ہے آج تک تیرا دیا اپنی جگہ

میں تو خیر اک خواب ہوں میری پریشانی نہ پوچھ
خواب کی تعبیر تُو ہے ، تُو بتا اپنی جگہ

گھیر لیتی ہے محبت اور خُوشبو اور موت
اس طرح ، جیسے بنا لے خود ہوا اپنی جگہ

میں نے دنیا مانگ لی ہوتی تو مل جاتا وہ شخص
میں تو سمجھا ہر دُعا کی ہے جزا اپنی جگہ

اپنی اپنی بارگہ ہے اپنی اپنی سجدہ گاہ
جان! تُو اپنی جگہ ہے اور خُدا اپنی جگہ

یہ جگہ بھرنے کو اپنا آپ خالی کر دیا
اس بھرے گھر میں مگر ، تیرا خلا اپنی جگہ

وہ نہیں ملتا تو پھر اُس کو خدا سے بھی نہ مانگ
عاشقی اپنی جگہ ہے اور اَنا اپنی جگہ

☆

○

کچھ روز سے یہ آئینہ دُھندلا بھی بہت ہے
دیکھے کوئی دل میں تو تماشا بھی بہت ہے

اب میلا ہے جیون کا لبادہ تو گِلہ کیوں
سچ یہ ہے کہ ہم نے اسے پہنا بھی بہت ہے

مانگے سے کبھی گوہرِ مقصود ملا ہے؟
یہ جانتے تھے، پر تجھے مانگا بھی بہت ہے

ایسی بھی نہیں تلخ محبت کی حکایت
یہ زہر پیا جائے تو میٹھا بھی بہت ہے

ہم اہلِ جنوں، وقت کے مقتل میں پلے ہیں
پر اپنا قبیلہ پھلا پُھولا بھی بہت ہے

اُلجھا بھی ہواؤں سے بہت پیار کا پرچم
لیکن یہی پرچم ہے کہ اُونچا بھی بہت ہے

کچھ رونا رُلانا مری تہذیب بھی ہے یار!
کچھ میر سا جینا مجھے بھایا بھی بہت ہے





بارِ جسم اور وزنِ جاں لے کر
اتنا ساماں ، چلیں کہاں لے کر

اک بریدہ سا داغِ جسم ، اک اِسم
ہم بھی نکلے ہیں ، کیا نشاں لے کر

جس کے پاؤں تلے زمیں ہی نہ ہو
کیا کرے سر پہ آسماں لے کر

ایک آنسو مجھے عطا کر دو
پانیوں سے بھرا جہاں لے کر

بیچ دی جاودانیٔ ناہست
ہم نے اک ہستِ رائگاں لے کر

دل فروشوں کے سامنے مت آ
یہ بدن کی بھری دُکاں لے کر

میں سرائے بدن سے نکلا ہوں
افتخار ایک کارواں لے کر





میں ایک حوالہ ہوں مجھے دھیان میں رکھنا
اک پھول مرے نام کا گلدان میں رکھنا

آنکھوں سے بتا دینا دل وجان کے احوال
افسانے کو افسانے کے عنوان میں رکھنا

سو حادثے ہوتے ہیں تعلق کے سفر میں
ٹوٹے ہوئے رشتوں کو بھی سامان میں رکھنا

تصویر بھی حیران ہے، آنکھیں بھی ہیں حیران
حیران کو کیا دیدۂ حیران میں رکھنا

موت اور خریدار بتا کر نہیں آتے
کچھ جنسِ وفا وقت کی دُکان میں رکھنا

ہوتا ہے جو ہر آن اُسے دھیان سمجھنا
جو ہو نہیں سکتا اسے امکان میں رکھنا

میں حاصلِ تفریق کبھی بھی نہ بنوں گا
تُم جب بھی رکھنا مجھے میزان میں رکھنا

☆



یہ میری آنکھ میں جو اَن کہی محبت ہے!
مرا تمام اثاثہ یہی محبت ہے

ادھورے پن سے تو لگتا ہے جیسے دنیا بھی
کسی کی نصف میں چھوڑی ہوئی محبت ہے

میں کیوں نہ چھوڑ دوں تیرے لیے جہاں بھر کو
بھرے جہاں سے مجھے کون سی محبت ہے

میں جانتا ہوں کہ ہے اور سا مرا انجام
میں جانتا ہوں مجھے اور سی محبت ہے!

یہ چاندنی جو مرے چار سُو ہے، یہ تُو ہے
یہ دل میں دھوپ سی جو ہے، تری محبت ہے

میں اس کی پہلی محبت ہوں افتخار مغل
مگر وہ شخص مری آخری محبت ہے





بتاؤں کہیں بھی، کبھی سر نہیں کیا ہم نے
یونہی تو زیست کو دُو بھر نہیں کیا ہم نے

بنا لیا تھا بزرگوں نے اک مکان، مگر
تمام عمر اسے گھر نہیں کیا ہم نے

دیا زیادہ ہے دنیا کو اور لیا کم ہے
کبھی حساب برابر نہیں کیا ہم نے

اگرچہ زیست کے بازار میں رہائش کی
پر اپنا نرخ مقرر نہیں کیا ہم نے

وہ آدمی ہے ہماری طرح، پہاڑ نہیں
سو اس کو چاہا، اسے سَر نہیں کیا ہم نے

سو افتخار مغل قصہ مختصر یہ ہے
کسی بھی شخص کو محور نہیں کیا ہم نے





تری صدا پہ پلٹ کر بھی ہم نے دیکھ لیا
سو نصف، نصف میں بٹ کر بھی ہم نے دیکھ لیا

بسِ اَنا بھی وہی اک سکوتِ مرگِ اَنا
کہ یہ نقاب اُلٹ کر بھی ہم نے دیکھ لیا

اب ایک بار بہم ہو کے بھی ذرا دیکھیں
کہ ایک ایک میں بٹ کر تو ہم نے دیکھ لیا

کبھی اُتار کے اک سمت رکھ دیے خدوخال
طلسمِ جسم سے ہٹ کر بھی ہم نے دیکھ لیا

ہمیں کو ڈالنی ہے اب سپر بہ مقتلِ زیست
اسی محاذ پہ ڈٹ کر بھی ہم نے دیکھ لیا

ہمیں تو زیست کا آموختہ نہ یاد ہُوا
کہ عمر بھر اسے رَٹ کر بھی ہم نے دیکھ لیا





تمھاری راہ کا اک رہ نورد ایسا تھا
جو اپنے آپ میں صحرا کی گرد ایسا تھا

سو اس کا چہرہ تھا سرسوں کے کھیت کے جیسا
کہ وہ بچھڑتے ہُوئے غم سے زرد ایسا تھا

بس ایک وار تھا جو سامنے سے آیا تھا
خوشا کہ دشمنوں میں ایک مَرد ایسا تھا

خلوص دل سے دعا کی تھی اپنے مرنے کی
گزشتہ رات تو فرقت کا درد ایسا تھا

تپش وہ تھی کہ سُلگتا تھا پیرہن اس کا
چُھوا تو برف تھا، جذبوں میں سرد ایسا تھا

غبار ہو کے بالآخر ہَوا کا رزق بنا
تمھارے شہر کا اک کُوچہ گرد ایسا تھا





تمھارے سامنے اک مرتبہ خُدا لے جائے
پھر اس کے بعد بلا سے اگر قضا لے جائے

گر آبرو ہی سلامت نہیں بہ مقتلِ زیست
تو پھر یہ کاسۂ سر کوئی کیوں بچا لے جائے

طِلا بنایا ہے، خود کو کھپا کے ہجراں میں
جسے ہوس ہو وہ ہم سے یہ کیمیا لے جائے

تمھارا سودا اگر سر میں ہے تو میں بھی ہوں
یہ مُشتِ خاکِ بدن ہے سو یہ ہوا لے جائے

اب ایسا صاحبِ ساماں بھی کون ہے جو یہاں
سفر پہ نکلے تو گھر سے ہی راستہ لے جائے

سو ہم نے پھینک دی باہر گلی میں یہ دُنیا
جسے بھی چاہیے ہو، وہ اِسے اُٹھا لے جائے





سوادِ ہجر میں رکھا ہوا دیا ہوں میں
تجھے خبر نہیں کس آگ میں جلا ہوں میں

میں قریہ، قریہ پھرا گرد باد بن کے جہاں
اسی زمین پہ پرچم صِفت اُٹھا ہوں میں

ابھی چھٹی نہیں جنت کی دھول پاؤں سے
ہنوز فرشِ زمیں پر نیا نیا ہوں میں

ہزار شکر کہ خود پر ہی اُستوار تھا میں
ہزار شکر کہ بنیاد پر گرا ہوں میں

مری شگفت کے موسم ابھی نہیں آئے
کہیں کہیں پہ مگر، پھر بھی کھل گیا ہوں میں

مری شکست بھی ہے فتحِ افتخارِ مغل
کہ یوں ہی بنتے بگڑتے ہوئے بنا ہوں میں



کم کسی غم کے گرفتار نظر آئیں گے
ہم ہی دو چار گنہ گار نظر آئیں گے

یہ جو ہم لوگ ہیں ، ہم ، پھول اُگانے والے
موسم آئے گا تو گلزار نظر آئیں گے!

سر اُٹھیں گے تو بڑا قہر بپا ہو گا یہاں!
سرو و شمشاد بھی کل دار نظر آئیں گے

یہی دہلیز کے پتھر ، یہی اُفتادہ سے لوگ
اُٹھ گئے تو یہی دیوار نظر آئیں گے!

قافلے گزریں گے مقتل سے اطاعت میں مری
کل یہی راستے ہموار نظر آئیں گے

یہی خوش قد ، یہی میرؔ اور اسدؔ اور اقبالؔ
دُور سے بس یہی مینار نظر آئیں گے

☆

صدمۂ حرفِ گرہ گیر نہیں دیکھا ہے!
آپ نے بھی پسِ تحریر نہیں دیکھا ہے

اس قدر سہم گئے دیکھ کے مقتل کو جو تم
تم نے شاید مرا کشمیر نہیں دیکھا ہے؟

میں نے اس غم کو چُھوا، اس کی تلاوت کی ہے
محض شعروں میں غمِ میرؔ نہیں دیکھا ہے

مری اس نسل نے دیکھے ہیں جہانگیر کئی
پر کہیں عدلِ جہانگیر نہیں دیکھا ہے

آپ نے نغمۂ زنجیر سنا ہے لوگو
آپ نے صاحبِ زنجیر نہیں دیکھا ہے

جان! بس تُو نے حکایات سُنی ہیں غم کی
جان! تو نے غمِ شب گیر نہیں دیکھا ہے

☆

○

ابھی تو گھاؤ ترے ہجر کا بھرا بھی نہیں
بھرا بھی ہو تو تاسّف؟ نہیں، ذرا بھی نہیں!

یہ دیکھ کر مری حیرت کی انتہا نہ رہی
کہ میں نے ہاتھ بھی پھیلا دیا، مرا بھی نہیں

میں تج بھی سکتا ہوں یہ کھیل اپنے ہونے کا
یہ کھیل، جس سے مرا دل ابھی بھرا بھی نہیں

تو مجھ کو وہ بھی نہیں سمجھا دوسروں کی طرح
جو اپنا آپ ہے میرا، جو دوسرا بھی نہیں

کہ چاہے جانے کی خواہش بھی چاہنے میں ہے
سو میرے یار! یہ سودا بہت کھرا بھی نہیں

میں اپنی قبر ہوں مدت سے افتخار مغل
اور افتخار مغل خود سے میں ڈرا بھی نہیں

☆

○

وہی تیرا حوالہ رہ گیا ہے
وگرنہ تو یہاں کیا رہ گیا ہے

میں پورا ہو گیا تو یاد آیا
مرا قصہ ادھورا رہ گیا ہے

تجھے تقسیم کر کے بھی، مری جاں!
کہو کتنا خسارہ رہ گیا ہے؟

یہ میلہ ختم سمجھو جسم و جاں کا
فقط میلے کا ملبہ رہ گیا ہے

محبت اب کہاں؟ ان موسموں میں!
محبت استعارہ رہ گیا ہے

چلو ہم ڈھے گئے، لیکن، محبت!
ترا پرچم تو اونچا رہ گیا ہے

☆



ہر ایک مرتبہ اک بھول مجھ پہ وار گیا
وہ جاتے جاتے مری آرتی اُتار گیا

کسی کے ہاتھ پہ بیعت نہ کر سکیں گے ہم
ہمارے دل سے اگر تیرا اقتدار گیا

مجھے تو مار نہ سکتی تھی موت بھی اے دوست
یہ اور بات، ترا ہجر مجھ کو مار گیا

وہ میرا اجر تھا، حاصل ہوا، ہوا نہ ہوا
میں اُس کا وقت تھا سو وہ مجھے گزار گیا

میں کھو گیا تو دوبارہ نہ مل سکوں شاید
کہ لوٹنے کا نہیں ہوں، گر ایک بار گیا

شکست ماننا مُشکل ہے افتخارؔ مغل
اَنا کی جنگ، وگرنہ وہ شخص ہار گیا





مری کشود کے وہ سارے پات کاٹ گیا
سنانِ تلخ سے شاخِ نبات کاٹ گیا

کہاں کٹی ہے ہر اک سے شبِ سیاہِ حیات
کمال کر گیا وہ، جو یہ رات کاٹ گیا

زبان کٹ گئی ہوتی تو مجھ کو رنج نہ تھا
پہ رنج یہ ہے کہ تُو میری بات کاٹ گیا

میں بٹ کے رہ گیا ہوں نصف نصف خود مجھ میں
کہ عین بیچ سے وہ میری ذات کاٹ گیا

غنیم خیمۂ جاں تک کہاں پہنچتے مگر
مرا ہی کوئی سپاہی قنات کاٹ گیا

بھلا ہو یار کے غم کا کہ جس کے جیتے میں
مجھ ایسا شخص بھی قیدِ حیات کاٹ گیا



○

اس موج میں بنتی نہیں دنیا سے زیادہ
ہم لوگ سبک چشم ہیں دریا سے زیادہ

یہ رنگِ شگفتِ گُلِ موجود نہیں ہے
فطرت کے کسی خندۂ بے جا سے زیادہ

جس آنکھ کی نسبت سے تھی میخانوں کو عزّت
ہم نے اسے دیکھا تھا تمنّا سے زیادہ

صحرا کی طرح صاحبِ اسرار بھی ہوں گے
وہ لوگ جو ویران ہیں صحرا سے زیادہ

اب ہجر ہے اک مرگِ مسلسل سی کوئی بات
یہ قصہ ہے اب کے سر و سودا سے زیادہ

کچھ لوگ ترے ہجر سے گزرے ہیں، اِدھر دیکھ!
کچھ جان سے گزرے ہیں زیادہ سے زیادہ

☆

○

اگر شعور کا بندِ نقاب کُھل جائے
حدیثِ اصلِ عذاب و ثواب کُھل جائے

حریمِ شعر پہ دستک دیے چلے جاؤ
عجب نہیں کہ کوئی ایک باب کُھل جائے

وہ جس کو خود پہ بھی کُھلنے نہیں دیا میں نے
اگر زمانے پہ میرا وہ خواب کُھل جائے

یہ میری ہست بندھی ہے تری محبت سے
میں سوچتا ہوں اگر یہ طناب کُھل جائے

غزل کی بات دلوں پر کُھلے تو ایسے کُھلے
ہوا پہ جیسے حدیثِ گلاب کُھل جائے

وہ اس طرح سے کُھلا مجھ پہ افتخار مغل
ہوا کے جھونکے سے جیسے کتاب کُھل جائے

☆

○

اب کے ہر ماتھے پہ ساون تشنگی لکھ جائے گا
شہر کے دیوار و در پر بے بسی لکھ جائے گا

مجھ کو ڈر ہے، رات کی تاریکیوں میں پھر کوئی
آشتی کے پرچموں پر دشمنی لکھ جائے گا

میں مٹا بھی دوں تو کیا ہوگا، مری دیوار پر
جس نے کل گالی لکھی تھی، آج بھی لکھ جائے گا

خون کی گونگی گواہی سے بچو، یہ مٹ کے بھی
وقت کے محضر پہ اپنی بے کسی لکھ جائے گا

کیا خبر ہے، سر پھرا سا کوئی شاعر کس سے
سوچ کی تختی پہ کتنی روشنی لکھ جائے گا

☆

○

اس جسم کی آشفتہ بیانی سے گزر کر
تھک جاتا ہے انسان جوانی سے گزر کر

بے رنگ نظر آتا ہے جس کو مرا کردار
دیکھے تو ذرا میری کہانی سے گزر کر

ہم تم بھی تو اے دوست! بہت ٹوٹ گئے ہیں
ٹوٹی ہوئی ترتیب زمانی سے گزر کر

لیکن کوئی پہنچا ہی نہیں دل کے متن تک
اجسام کے الفاظ و معانی سے گزر کر

بھیگی ہوئی لگتی ہے ہر اک چیز کی تصویر
اس آنکھ میں ٹھہرے ہوئے پانی سے گزر کر

☆



یوں ہی تو دل و جاں کی یہ حالت نہیں کی ہے
خوں تھوک لیا ہے پہ شکایت نہیں کی ہے

اُس نے بھی نہ کھولی کبھی باتوں میں چھپی بات
ہم نے بھی کبھی اُس سے وضاحت نہیں کی ہے

یہ جسم! یہ مٹی کا گھروندا تو اُسارا
لیکن کبھی اس گھر میں سکونت نہیں کی ہے

پھر دل کسی دھوکے میں نہ آیا کسی صورت
پھر ہم نے کسی سے بھی محبت نہیں کی ہے

کچھ روز سے ہے گردشِ ایام بہت سُست
کچھ دن سے اُن آنکھوں کی تلاوت نہیں کی ہے





آنسو کوئی آنکھوں سے نکلنے نہیں دیتا
وہ مُجھ کو جلاتا ہے، پگھلنے نہیں دیتا

جس شخص کو پہنائیاں دیں میرے لہو نے
وہ مجھ کو حصاروں سے نکلنے نہیں دیتا

ہر گام پہ اک زخم بھی دیتا ہے وہ ضدی
آنکھوں میں نمی بھی وہ مچلنے نہیں دیتا

وہ میرے مداروں میں بھی داخل نہیں ہوتا
محور بھی مجھے اپنا بدلنے نہیں دیتا

شب زاد کوئی دیپ جلائے گا بھلا کیا
دیپک مرے حصے کا بھی جلنے نہیں دیتا





ترے خیال نے کیا کیا جگا دیا مجھ میں
کہ مجھ کو تو نے دوبارہ بنا دیا مجھ میں

ہوا چلی تو دریچے سے آ کے خوشبو نے
کوئی چراغ سا جیسے جلا دیا مجھ میں

بڑے دنوں میں فراغت ملی تو جانِ خیال
ترے وجود نے اپنا پتا دیا مجھ میں

کچھ ایسا ہے کہ نہ بھولا ہے تو، نہ یاد رہا
کہ جلتا، بجھتا رہا ہے ترا دیا مجھ میں

میں سوچتا تھا کہ میں اک گمان ہوں شاید
کہ ایک دھیان نے مجھ کو جگا دیا مجھ میں





جذبۂ دل کی صدا کافی ہے
ہم کو یہ راہنما کافی ہے

آبِ شبنم کی طرح ہیں ہم لوگ
ہم پہ کرنوں کی ردا کافی ہے

آنکھ میں باقی ہو گر بینائی
ایک مٹی کا دیا کافی ہے

گنبدِ فکر نما میں اب بھی
سانس لینے کو ہوا کافی ہے

ابھی آگے کی سزائیں نہ سنا
ابھی جینے کی سزا کافی ہے



میں تجھ کو یاد کروں، اور تجھے سنائی نہ دے!
ہے کھوٹ مجھ میں کہیں، تو کوئی صفائی نہ دے

ہم اہلِ درد کا دریا سا ظرف ہے لوگو!
کہ ڈوب جائے سمندر میں اور دُہائی نہ دے

میں اس کے طاق پہ جلتا ہُوا دیا ہوں ایک
وہ مجھ کو نیند سے پہلے کہیں بُجھا ہی نہ دے

یہ رنج موت سے پہلے ہی مار دیتا ہے
خُدا ملا ہی اگر دے تو پھر جُدائی نہ دے

تو پھر یہ عشق نہیں افتخار دھوکا ہے
گر اُس کی شکل مری شکل میں دِکھائی نہ دے





دل کو دُنیا میں جو رہنا پڑ جائے!
جو نہ سہنا ہو، وہ سہنا پڑ جائے

وہ، جو برفاب بنا بیٹھا ہے
کیا خبر ہے اسے بہنا پڑ جائے

اُس طرحدار کی چھب دیکھے کوئی
اس کو جب شام کا گہنا پڑ جائے

کچھ تو ترتیبِ جہاں کو بدلیں
اس خرابے میں جو رہنا پڑ جائے

یوں نہ ہو شعر کے مضمون کو اب
صاف الفاظ میں کہنا پڑ جائے





دل کا جلتا دیا نہیں ٹوٹا
ورنہ اس گھر میں کیا نہیں ٹوٹا؟

میرا پندار ناشکستہ ہے
دیکھ! یہ آئنہ نہیں ٹوٹا

ہم اگر ٹوٹ بھی گئے تو کیا
آپ سے رابطہ نہیں ٹوٹا

میں نے پوچھا وہ "درد کا ناتا"؟
اس نے فوراً کہا "نہیں ٹوٹا"

اے ہوا! تیرے سانس ٹوٹ گئے
دیکھ لے! میں ذرا نہیں ٹوٹا!





مری زبان بریدہ تو کیا سنائے گی
قبا سے بات کرو، واقعہ سنائے گی

تری نگاہِ فسانہ طراز کا کیا ہے
پلٹ کے آئی تو قصہ نیا سنائے گی

سزا جزا تو کسی مقتدر نے دینی ہے
عدالت اس کا فقط فیصلہ سنائے گی

چراغ شب کا موقف چراغِ شب سے سنو
ہوا کا مسئلہ کیا ہے، ہوا سنائے گی

حدیثِ زیست بہر طور ہم سنا جائیں
اور اس کے بعد کا قصہ قضا سنائے گی

☆



یوں خشت و گل و سنگ کے انبار لگا کر
کب شہر بنا کرتے ہیں معمار لگا کر

اک وہ تھے کہ جو میرؔ بنے عشق کے صدقے
اک ہم، کہ خجل، عشق کا آزار لگا کر

ہم جیسے کئی اہلِ ہنر جی لیے اے دوست
ٹوٹے ہوئے خوابوں کا یہ بازار لگا کر

لوگ اور بھی اک دوسرے سے دُور ہوئے ہیں
یُوں، شہر میں دیوار سے دیوار لگا کر

اک عمر کے بعد آج ملا کانچ سا وہ شخص
چھوڑا ہے جسے وقت نے زنگار لگا کر

☆



زُلفِ شب رنگ کو ظلمت کی علامت کریں ہم؟
اس سے بہتر ہے کوئی اور حکایت کریں ہم

تُو وہ خوشبو ہے جو رکھتی ہے گرفتار ہمیں
اور خوشبو کی بھلا کیسے وضاحت کریں ہم

وقت نے ہم کو عجب موڑ پہ ملوایا ہے
وقت سے، جان! مگر کیسے شکایت کریں ہم

جب تجھے پا کے بھی کھو دینا ہی ٹھہرا مری جاں
تجھ کو پانے کے لیے کیوں تری منت کریں ہم

ہم بھی تیمور کی اولاد ہیں غالب کی طرح
مار دیتے ہیں اُسے، جس سے محبت کریں ہم

☆



اس کی آنکھوں میں کوئی ایسی حکایت تھی کہ بس!
اور کہانی پر ہمیں بھی اتنی حیرت تھی کہ بس!

دل سا وحشی زیر کر کے بھی تھا میں ہارا ہوا
وصل کی ساعت گزرنے پر وہ حسرت تھی کہ بس!

جینے پر آئے تو ہم بھی جی لیے اس کے بغیر
ہم! جنھیں اس شخص کی اتنی ضرورت تھی کہ بس!

دل کو تیرے رنگ و بو کا ایسا لپکا تھا، نہ پوچھ
جاں کو تیری عادتوں کی ایسی عادت تھی کہ بس!

میں نہ تھکتا تھا، یہ سڑکیں تھک گئی تھیں افتخار
غم کی پہلی شام تو اس درجہ وحشت تھی کہ بس!





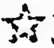
یہ ہم جو چپ ہیں کوئی ماجرا نہیں کہتے
ہمارے آنسوؤں سے پوچھ، کیا نہیں کہتے

ہم ایسے سادہ طبیعت کہاں ملیں گے تمھیں
کہ لٹ لٹا کے بھی ہم تم کو بُرا نہیں کہتے

وہ اور لوگ تھے جو تم کو تم سے مانگ گئے
ہم اور لوگ نہیں، ہم مدّعا نہیں کہتے

زبانِ حال سے کیوں اپنے دل کا حال کہیں
ہمارے شعر کوئی اَن کہا نہیں کہتے؟

جو بددُعا کی طرح تلخ کر گیا ہے ہمیں
ہم اس کے باب میں بھی بددعا نہیں کہتے



○

ہم کوئی جھوٹ تو نہیں کہتے
تم نہ چاہو تو لو، نہیں کہتے

دیدۂ نم کی بات بھی تو سنو
وہ بھی کہتے ہیں، جو نہیں کہتے

اک کہانی ہمیں بھی کہنا تھی
خیر، تم خوش رہو! نہیں کہتے

کہہ رہے ہو تو سچ سمجھ لوں گا
سچ، اگر سچ کہو، نہیں کہتے

اَن کہے کو کہا گیا۔ سمجھو
جو کہا دوستو، نہیں کہتے



○

موج و مستی سے واسطہ کیا ہے
ہم کو دریاؤں نے دیا کیا ہے

ایک پل کو تجھے نہ سوچوں تو
سوچتا ہوں کہ یہ کیا کیا ہے

اک لپک ہے غرورِ آئینہ
اور آئینے میں رکھا کیا ہے

بے محبت بھی جی تو لوں لیکن
ایسے جینے کا فائدہ کیا ہے

کل مجھے آئینے نے ہنس کے کہا
اس کو کھو کر تجھے ملا کیا ہے؟

○

ڈھل ڈھلا کے اور بھی پیارا لگا بارش کے بعد
جانے کیوں گاؤں مجھے تجھ سا لگا بارش کے بعد

دھوپ نکلی تو اکیلے پن نے پھر سے آ لیا
اور بھی اپنا سفر تنہا لگا بارش کے بعد

چل پڑی جہلم کنارے پھر سے آزادی کی بات
جب کوئی لاشہ کنارے آ لگا بارش کے بعد

اپنی مٹی کی مہک، کچی چھتوں کی بات ہے
کچا کوٹھا کس قدر اچھا لگا بارش کے بعد

چند بوندیں تشنگی کو اور تیکھا کر گئیں
مجھ کو اپنا آپ اک صحرا لگا بارش کے بعد

☆

○

ہمارا لہجہ تھا جبریل کے پروں جیسا
مگر، تمھارا رویہ! ستمگروں جیسا

جو سر کو بیچنے نکلے ہوں آبرو کے عوض
مزاج کیوں نہ بنالیں وہ خود سروں جیسا

یہ کون ہے جو ہواؤں سے بھی نہیں ٹوٹا
یہ کون ہے مرے اندر پیمبروں جیسا!

ہر اک کواڑ پہ دستک، ہر آستاں پہ صدا!
ہے روز گارِ ہوا بھی گداگروں جیسا

بلا کا شور بھی دل ٹوٹنے پہ ہوتا ہے
اور اک سکوت بھی گہرے سمندروں جیسا

☆



وہ سر ہی اور ہیں جن میں ہوا نہیں ہوگی
ہم اہلِ درد سے تو التجا نہیں ہوگی

قضا و قدر کی بات اور، ورنہ جیتے جی
تمہارے غم کی تلاوت قضا نہیں ہوگی

وہ خود نگر، وہ بنفشے کے پھول سی لڑکی
ہوا کے سامنے بھی بے ردا نہیں ہوگی

یہ دل کا پھول مہکتا ہے جب تلک، اس سے
ترے خیال کی خوشبو جدا نہیں ہوگی

میں مانتا ہوں بچھڑنا ہے اور جانتا ہوں
مری طرف سے مگر ابتدا نہیں ہوگی

☆



جس سے ایک زمانہ پیچھے رہ جاتا ہے
وہ بھی خود سے کتنا پیچھے رہ جاتا ہے

ہجر کا لمحہ ڈھل کر بھی ڈھلنے نہیں پاتا
ہجر کے بھوت کا سایہ پیچھے رہ جاتا ہے

پل دو پل وہ بیٹھ کے چل دیتا ہے لیکن
کوئی اس کے جیسا پیچھے رہ جاتا ہے

مر جاتا ہے بوڑھا چاند اماوس مارا
اور تاروں کا کنبہ پیچھے رہ جاتا ہے

آ کر بھی انسان کو موت نہیں آتی ہے
جا کر بھی یہ دریا پیچھے رہ جاتا ہے

☆

** میں تو دریا ہوں سمندر میں [illegible]



کسے خیال تھا میلے کا اس جھمیلے میں
تمام خلق اُسے دیکھتی تھی میلے میں

ہوا کو نام و نسب یاد ہے مرا، ہم لوگ
بہے نہیں ہیں کبھی بھی ہوا کے ریلے میں

وہ میرے گاؤں کی لڑکی، مرے پڑوس کی اوس
چمک رہی ہے مری شاعری کے بیلے میں

اسی جہاں کے عوض بیچ دی محبت تک
یہی جہاں کہ جو مہنگا تھا مجھ کو دھیلے میں

میں ایسے شخص سے ڈرتا ہوں افتخار مغل
جو اپنے آپ سے ڈرتا نہیں اکیلے میں





وہ، جو آنکھوں میں اُترنے کی دعا مانگے گا
ایسا ڈوبے گا، اُبھرنے کی دعا مانگے گا

اتنی شدت سے تجھے چاہا، زمیں پہ جیسے
آخری آدمی مرنے کی دعا مانگے گا

بلبلا اُٹھا ہے جو عشق کے گھاؤ پہ، وہی
عمر بھر گھاؤ نہ بھرنے کی دعا مانگے گا

آدمی اتنا بگڑ جائے گا اپنے ہاتھوں
آدمی اپنے سنورنے کی دعا مانگے گا

بے نیازانہ رہِ دل سے گُزرنے والے!
پھر اسی رہ سے گُزرنے کی دعا مانگے گا





ابھی تک نہ سُلجھی، شروعات میں اک گرہ پڑ گئی تھی
ملاقات تھی اور ملاقات میں اک گرہ پڑ گئی تھی

مرے ہات پر رات کا تھان کھلتا چلا جا رہا تھا
پھر ایسے ہوا تھا کہ اس رات میں اک گرہ پڑ گئی تھی

میں اب تک بندھا ہوں اسی عُقدۂ ناکشودہ کے اندر
وہیں ہوں جہاں پر خیالات میں اک گرہ پڑ گئی تھی

مجھے ایسی حیرت سے کیوں دیکھتے ہو، مرے ہم جلیسو!
میں وہ شخص ہوں جس کے حالات میں اک گرہ پڑ گئی تھی

ابھی تک مرے درد کی فرد بے فیصلہ ہے، گواہو!
گواہو! تمھارے بیانات میں اک گرہ پڑ گئی تھی





تری لکیر کے، اے عشق! اب فقیر نہیں
ہمارے عہد کے ترکش میں تیرا تیر نہیں

مجھے بھی آتے ہیں سب عشق کے ادب آداب
مگر میں آدمی ہوں! میں غبارِ میرؔ نہیں ☆

یہ جان کر بھی اُسے چاہا عمر بھر میں نے
کہ اس کے ہاتھ میں دل کی کوئی لکیر نہیں

یہ میں نہیں ہوں! زمانہ ہے!! اور زمانہ تو
تمھاری زلفِ گرہ گیر کا اسیر نہیں

یہ سارے رنگ پریدہ ہیں افتخار مغلؔ
بدن کے ذہن سے یہاں کوئی بھی امیر نہیں



☆ دور بیٹھا غبارِ میرؔ اُن سے
عشق بن یہ ادب نہیں آتا



اک واقعہ ہے دھیان کے پَل میں بندھا ہوا
جیسے کوئی خیال ، غزل میں بندھا ہوا

مجھ ایسا شخص آج میں کیسے جیے بھلا؟
ہو جس کا کُل اثاثہ ہی کَل میں بندھا ہوا

میں کس کی قید کاٹتا ہوں ، کس کا جرم ہے
مدّت سے میری فردِ عمل میں بندھا ہوا

تجھ سے بندھا ہوا ہے مرے کل کا ایک پَل
سامانِ زیست ہے اسی پَل میں بندھا ہوا

اس کا حوالہ سہل ، مگر سہلِ ممتنع
اچھا لگے گا میری غزل میں بندھا ہوا





دل جھیل میں اترتے ہوئے پانی کی طرح ہے
اور دل میں وہ بیدلؔ کے معانی کی طرح ہے

وہ شخص بھی رہتا ہے ہمیشہ تر و تازہ
وہ شخص بھی اک لوک کہانی کی طرح ہے

اک خانۂ ویراں ہے بغیر اس کے یہ دنیا
اس بیت میں وہ مصرعۂ ثانی کی طرح ہے

اے زیست! تجھے جتنا بھی روئے کوئی ، کم ہے
اے زیست! تُو قاسم کی جوانی کی طرح ہے

اب عرضِ تغزُل میں کہاں رنگِ تغزل
ہر صنفِ سخن مرثیہ خوانی کی طرح ہے



○

رُخصتِ یار کا مضمون بہ مشکل باندھا
دل نہ بندھتا تھا کسی طور ، بڑا دل باندھا

ہم نے بھی باندھ لیا زیست کا اسباب وہیں
جب سنا یارِ سفر دار نے محمل باندھا

ہم نے اس چہرے کو باندھا نہیں مہتاب مثال
ہم نے مہتاب کو تجھ رُخ کے مماثل باندھا

دل نے دیکھا کہ خجل تھا ترے عارض سے گلاب
جب بہ عنوانِ سخن ان کو مماثل باندھا

اور کیا باندھتے ساماں میں بہ ہنگامِ سفر
صرف دامن میں خسِ کُوچۂ قاتل باندھا

☆

○

تُو نے رُلایا اتنا ہمیں زندگی کہ بس
اب آگے کیا خیال ہے؟ اب اور بھی کہ بس؟

ناگفتہ ہی بھلی تھی مری داستانِ درد
ایسی تھی دلخراش کہانی مری کہ بس

ہم تھے ہی سخت جان ، وگرنہ تمھارے بعد
حالت ہمارے دل کی کچھ ایسی رہی کہ بس

کچھ لوگ ایسے درد طلب تھے کہ الحفیظ!
بستی میں اک ہوائے جفا وہ چلی کہ بس

ہر لحظہ اک صلیب تھا اُس شب کا انتظار
غم کی سیاہ رات کچھ ایسے کٹی کہ بس

☆



اتنے لپکا کے جو دیکھو گے درِ یار کو تم
اور کر دو گے خبردار ، خبردار کو تم

اینٹ گارے سے تو زنداں بھی بن جاتے ہیں
گھر سمجھ لیتے ہو لوگو! در و دیوار کو تم

مال اچھا ہے ، پہ بازار کی تیزی معلوم
ایسی تحقیر سے مت دیکھو خریدار کو تم

آگ تو پھیلے گی بستی کے گلی کوچوں میں
ایسے دہکاؤ گے جب شعلۂ رُخسار کو تم

افتخار ایسا بھی آسان نہیں ترکِ وفا
عمر بھر ترسو گے اس سایۂ دیوار کو تم

☆



یوں ہم یہاں پہ رہ کے ہمیشہ الگ رہے
تاروں سے جیسے صُبح کا تارہ الگ رہے

مجھ کو کسی بزرگ نے دی تھی کبھی دعا
"تُو بھی الگ ہے، جا تری دُنیا الگ رہے"

ہم بھی تماشبیں تھے ، پر ایسے الگ تھلگ
میلے سے جیسے چشمِ تماشا الگ رہے

صحرائے زندگی کا سفر بھی کیا ، مگر
اس کی حدوں سے صورتِ دریا الگ رہے

جینے کا دردِ سر بھی ہے جینے کے ساتھ ساتھ
لیکن کسی کے عشق کا نشہ الگ رہے

☆

○

اتنے للچا کے جو دیکھو گے در یار کو تم
اور کر دو گے خبردار ، خبردار کو تم

اینٹ گارے سے تو زندان بھی بن جاتے ہیں
گھر سمجھ لیتے ہو لوگو! در و دیوار کو تم

مال اچھا ہے ، پہ بازار کی تیزی معلوم
ایسی تحقیر سے مت دیکھو خریدار کو تم

آگ تو پھیلے گی بستی کے گلی کوچوں میں
ایسے دہکاؤ گے جب شعلۂ رخسار کو تم

افتخار ایسا بھی آسان نہیں ترکِ وفا
عمر بھر ترسو گے اس سایۂ دیوار کو تم

☆

○

یوں ہم یہاں پہ رہ کے ہمیشہ الگ رہے
تاروں سے جیسے صبح کا تارہ الگ رہے

مجھ کو کسی بزرگ نے دی تھی کبھی دعا
"تو بھی الگ ہے، جا تری دنیا الگ رہے"

ہم بھی تماشبیں تھے ، پر ایسے الگ تھلگ
میلے سے جیسے چشمِ تماشا الگ رہے

صحرائے زندگی کا سفر بھی کیا ، مگر
اس کی حدوں سے صورتِ دریا الگ رہے

جینے کا دردِ سر بھی ہے جینے کے ساتھ ساتھ
لیکن کسی کے عشق کا نشہ الگ رہے

☆

○

ہم پیروی کے عادی نہیں ہیں اسے کہو
یا تو قدم ملا کے چلے، یا الگ رہے

وہ ہم نہیں جو شاہرہِ عام پہ چلیں
ہم رہروانِ درد کا رستہ الگ رہے

سرگرمیٔ جنوں کا بھی سودا رہے جدا
لیکن خیالِ تنگیٔ صحرا الگ رہے

وہ اور ہوں گے جو تری چوکھٹ پہ سو گئے
میں اور ہوں سو میرا حوالہ الگ رہے

ہم اس گناہ گار زمانے میں رہ کے بھی
اس کے معاملات سے گویا الگ رہے

☆

○

گمان خانۂ دیوار و در کے ہوتے ہوئے
میں عمر بھر رہا بے گھر ہی، گھر کے ہوتے ہوئے

لباسِ جنت میں بھی۔ بے لباس ہے تا بست!
ہم اہلِ درد کے اہلِ نظر کے ہوتے ہوئے

خدا نہ کردہ ہمیں منزلوں کی خواہش ہو
تمھارے جیسے کسی ہمسفر کے ہوتے ہوئے

خجل ہے دشت، صبا منفعل ہے، مجھ ایسے
خراب وخستہ تن و در بدر کے ہوتے ہوئے

وہ اور ہوں گے جو مقتل سے لوٹ آئے تھے
کہ ہم جھکے نہیں، شانوں پہ سر کے ہوتے ہوئے

☆



آتشِ ہجراں کا درماں اشک افشانی کرے
آگ وہ کچھ کر نہیں سکتی ہے جو پانی کرے

کوئی اُن زلفوں کا زنجیری نہ ہو تو وہ اسے
گفتگو کی پھیلتی خوشبو کا زندانی کرے

کون اک انساں کی خاطر زندگی تج دے یہاں
کون ساری عمر اک غم کی نگہبانی کرے

ہے زیارت گاہِ حیراناں یہ غالبؔ کا کلام
مصحفِ قرطاس اس حیرت پہ حیرانی کرے

عشق کے غم سے عقیدت ہو جسے وہ افتخارؔ
میرؔ کے مرقد پہ جا کر فاتحہ خوانی کرے

☆



جس جس جگہ وہ نقشِ کفِ پا چمک گیا
اک آئینہ سا ہر دلِ ذرّہ چمک گیا!

پُل پر کھڑی اداس سی لڑکی کو کیا خبر
کس عکس کے جمال سے دریا چمک گیا

دل کا لہو جو صرف ہوا، سو ہوا مگر
کچھ تو عروسِ غم کا سراپا چمک گیا

اک آشنا سی چاپ گلی میں سُنائی دی
اک پردہ اُٹھا، ایک دریچہ چمک گیا

ترکِ وفا پہ ضبط بلا کا کیا، مگر
پلکوں پہ ایک آدھ ستارہ چمک گیا

☆

○

ہر ایک شخص خود اپنا غبار لگتا ہے
ہر ایک شخص مجھے انتشار لگتا ہے

میں اتنی بار مرا ہوں اور اتنی بار جیا
کہ اپنا گھر مجھے اپنا مزار لگتا ہے

سُنا ہے تُو نے مجھے پالنا تھا بارِ الٰہ
سنا ہے تُو مرا پروردگار لگتا ہے!

یہ عشق واقعی دریا ہے آگ کا، اس میں
جو کوئی ڈوبتا ہے سو ہی پار لگتا ہے

جو سوگوار ہو میری طرح، اُسے ہر شخص
ہزار خوش ہو مگر سوگوار لگتا ہے

☆

○

ایک میں ہوں اور اک دوسرا ہے مرا ایک پیکر میں بستے ہیں دو اجنبی
آج پہلی دفعہ جانے کیا سوچ کر میں نے اُس سے کہا "کچھ کہو اجنبی"!

ایک خوش چشم ایسا بھی ہے شہر میں جس کی آنکھوں میں جو کوئی دیکھے، اُسے
یوں لگے جیسے تحریرِ سُرمہ کہے "میری پلکوں تلے سو رہو اجنبی"!

اور پھر پھلجھڑی سی وہ لڑکی مجھے زیست کے راستوں میں دکھائی نہ دی
جس نے رنگوں کے میلے میں مُجھ سے کہا "راستہ دو دھنک کو! ہٹو اجنبی!!"

ہاں! مسافت کی اک شام یُوں بھی ڈھلی پیڑ کے ایک ڈھلتے ہوئے سائے نے
راستہ کاٹ کر میرا، مجھ سے کہا "آج کی شام مُجھ میں بسو اجنبی"

دیر تک دیکھ کر ہاتھ میرا نجومی نے مجھ سے کہا مسکراتے ہوئے
"تُم کو خطرہ نہیں ہے کسی اور سے ہاں مگر خود سے ڈرتے رہو اجنبی!"

☆

○

بس ایک ضد! مرادہ خواب، اک دُعا! مرا پیار
مری وفا مرے مولا! مرے خدا مرا پیار!!

مجھے تو تیرا کوئی نظر نہیں آتا!
بس ایک میرا خدا اور دوسرا مرا پیار

تم اپنی اپنی کہانی سناؤ درویشو!
مرا تو سارا فسانہ مری اَنا، مرا پیار

ہزار راستے جاتے ہوں زندگی کی طرف
مرے لیے تو فقط ایک راستا — مرا پیار

میں دوسروں کو بھی آباد رکھنے والا تھا
مجھے تو دوستو! برباد کر گیا مرا پیار

☆

○

جہاں بام و در و دیوار مل کے گھر ٹھہرتا ہے
وہاں کب کوئی ایسے حبس کے اندر ٹھہرتا ہے

تری آنکھوں میں میرا عکس بن جانا ہی کافی ہے
کہ ان جھیلوں پہ مشکل سے کوئی منظر ٹھہرتا ہے

جو تم نے اپنی ترجیحات بدلی ہیں تو کیا شکوہ
یہاں پر کون ہے جو ایک محور پر ٹھہرتا ہے

ہماری بستیوں کے لوگ بونے ہیں تو حیرت کیوں
یہاں تو پورے قد کا آدمی خود سر ٹھہرتا ہے

بہت سے نقش بنتے ٹوٹتے رہتے ہیں شعروں میں
غزل کے پانیوں پر کب ترا پیکر ٹھہرتا ہے

☆



کوئی دیا نہ سہی دل میں غم کا داغ تو ہے
خدا کا شکر ہے گھر میں کوئی چراغ تو ہے

تمھارے غم نے جہاں کا نہیں رکھا، نہ سہی
فروغِ درد و غمِ ہجر میں فراغ تو ہے

کہاں کے میر ہیں ہم بھی، مگر ہیں میر پرست
ہمیں جو عشق کا دعویٰ نہیں، دماغ تو ہے

تو بے نشان سہی، پھر بھی، افتخار مغل
تھکا تھکا ہوا لہجہ ترا سراغ تو ہے

☆



مجھے چراغ مجھے آئنہ بنا رکھا
تمھارے نقشِ قدم سے معاملہ رکھا

بہت بنا کے رکھی ہے تمھارے ہجراں سے
ہر ایک درد سے اس درد کو جدا رکھا

بہت ہوا تو اندھیروں سے گفتگو کر لی
بہت رکھا تو ہوا سے مکالمہ رکھا

غزل کی صنف پرانی سہی مگر ہم نے
تمھاری یاد کے مضمون کو نیا رکھا

☆

○

اُڑتے، اُڑتے یونہی تجھ سورج کے آگے آ گئے
ورنہ ہم بادل، تو نکلے تھے برسنے کے لیے

حُسن تو ہوگا، مگر، ہم ہی نہ ہوں گے دوستو
ایک دن آنکھیں ترستی ہیں، ترسنے کے لیے

شام کی سیڑھی اُتر کر ایک ناگن کی طرح
رات کھڑکی سے اُتر آئی ہے ڈسنے کے لیے

ہم نے اُن آنکھوں میں بھی راتیں گزاریں افتخار
بستیاں اُجڑی ہیں جن آنکھوں میں بسنے کے لیے



○

نئی بنائی علامت پہ کب گزارا کیا
تمھاری زلف کو دریا کا استعارہ کیا

شبِ دراز سفر تھی یہ زیست، سو ہم نے
تمام رات تری آنکھ کو ستارا کیا

وہیں پہ رکھ دیا اسبابِ بست ہم نے جہاں
تمھاری جنبشِ ابرو نے اک اشارہ کیا

مجھے دکھائی دیے ہیں مزار خوابوں کے
تمھارے باب میں جب میں نے استخارا کیا





میں قد سے فروتر کسی دَر سے نہیں گزرا
صد شکر کہ پانی ابھی سر سے نہیں گزرا

پہنچا ہوں کسی اور طرف سے سرِ منزل
میں زندگی کی راہ گزر سے نہیں گزرا

تُو نے تو ابھی 'عشق' کتابوں میں پڑھا ہے
یہ تیر، ابھی تیرے جگر سے نہیں گزرا

اک راہ نکلتی تھی محبت کی طرف بھی
تُو جان بُجھ کے اے دوست! اُدھر سے نہیں گزرا





ہمارے بس میں نہیں یہ مشاورت کرنا
کٹھن ہے زندگی! تجھ سے معاملہ کرنا

نہیں کہ تم کو کبھی چاند ہی بتائیں گے
جو خود کو دیکھتا تو مجھ کو آئینہ کرتا!

جو وہ نہ ہوتا کوئی اور بے وفا ہوتا
کہ سہل بات نہیں پیار مشغلہ کرنا

ہر ایک شخص نہیں ہوتا افتخار مغل
کبھی جو ٹوٹتا تو مجھ سے رابطہ کرتا

☆

○

احوال پوچھ لیجیے، حالت نہ پوچھیے
ہم تشنگاں سے پیاس کی شدت نہ پوچھیے

آنکھوں سے پوچھ لیجیے آنکھوں کی آرزو
دل بوالہوس ہے اس کی ضرورت نہ پوچھیے

ہم نے لہو دیا ہے ہر اک حرف کے عوض
ہم سے ہمارے شعر کی قیمت نہ پوچھیے

لگتا ہے آپ گاؤں سے آئے ہیں افتخار
شہروں میں تو خلوص کی قلت نہ پوچھیے



○

کیوں تیرتی ہے آنکھ اگر بجھ گیا چراغ
ہر شے ہے کم فروز تو کیا آنکھ، کیا چراغ

کچھ کوس ایک دھیان کی خوشبو میں بھی کٹ گئے
کچھ روز ایک یاد کا جلتا رہا چراغ

ہے موت بھی شمال سے آئی ہوئی ہوا
ہستی بھی ہے منڈیر پہ رکھا ہوا چراغ

وہ رات بھولنے کی نہیں جانِ افتخار
یا تیرا انتظار تھا، یا میں تھا، یا چراغ



○

پاؤں پہ میرے جب تری دستار گر گئی
دشمن! مرے بھی ہاتھ سے تلوار گر گئی

اک شور سا سنائی دیا میری رُوح میں
پھر یوں ہوا کہ جسم کی دیوار گر گئی

یوں بھی نہیں کہ دل کی وہ پہلی سی قدر ہو
یوں بھی نہیں کہ طبعِ خریدار گر گئی

ہم سرکشوں کی کُہنہ روایت ہے افتخار
سر بھی وہیں گِرا، جہاں دستار گر گئی



○

کسی سبب سے جو عزمِ سفر نہیں رکھتے
تو یُوں نہیں کہ کوئی رہ گزر نہیں رکھتے

میں سرکشوں کے قبیلے کا فرد ہوں، ہم لوگ
نہ ہوں کشیدہ تو شانوں پہ سر نہیں رکھتے

محبتوں میں پلٹنے کی بات کرتے ہو!
یہ وہ مکان ہے ہم جس میں در نہیں رکھتے

بس آپ رو لیا کرتے ہیں اپنی حالت پر
ہم اپنے ساتھ کوئی نوحہ گر نہیں رکھتے **



** مقدور ہو تو ساتھ رکھوں نوحہ گر کو میں ــــ غالب

○

بدن کا ڈھلتا ہوا دوسرا پہر کب تک؟
یہ راز اُس پہ کھلے گا کبھی، مگر، کب تک!

مگر، ابھی تو یہاں میں بھی ہوں، ہنر بھی ہے
یہ اور بات میں کب تک، مرا ہنر کب تک

میں اپنے آپ میں اک گردباد تھا اے دوست
سو اس سفر میں کوئی میرا ہمسفر کب تک

ہے مصلحت بھی کوئی چیز افتخار مغل
لیے پھرو گے ہتھیلی پہ اپنا سر کب تک



○

مثالِ برق کبھی دیر تک چمک مجھ میں
میں آئنہ ہوں ترا، تو کبھی جھلک مجھ میں

یہ میں ہوں یا کوئی کوچہ ہے پھول والوں کا
رچی ہوئی ہے ازل سے یہ کیا مہک مجھ میں

وہ بازگشت ہی سننے میں عمر بیت گئی
کہ گونجتا رہا اک نام دیر تک مجھ میں

خیالِ یار! تو خوشبو کا ایک دریا ہے
خیالِ یار! خدارا ابھی چھلک مجھ میں



○

آنسو کوئی آنکھوں سے نکلنے نہیں دیتا
وہ مجھ کو جلاتا ہے، پگھلنے نہیں دیتا

جس شخص کو پہنائیاں دیں میرے لہو نے
وہ مجھ کو حصاروں سے نکلنے نہیں دیتا

وہ میرے مداروں میں بھی داخل نہیں ہوتا
محور بھی مجھے اپنا بدلنے نہیں دیتا

شب زاد کوئی دیپ جلائے گا بھلا کیا
دیپک مرے حصے کا بھی جلنے نہیں دیتا



○

زیست اک دھند تھی، جو چھٹ گئی اس کی دھن میں
بڑھ گئی عمر، نظر گھٹ گئی اس کی دھن میں

آج اک اور برس بیت گیا اس کے بغیر ٭
آج اک اور صدی کٹ گئی اس کی دھن میں

موج ہستی کے طلاطم کو نہ میں دیکھ سکا
میری کشتی تو الٹ ہی گئی اس کی دھن میں

افتخار اب کے سمٹنے کی نہیں یہ تسبیح
یہ اکائی تو مری بٹ گئی اس کی دھن میں



٭ فراز

○

نشانِ حُرمت و توقیر تک پہنچنا ہے
سُخن کو بارگہِ میرؔ تک پہنچنا ہے

کوئی غزال صفت ہے تو اُس کو آخرِ کار
ہمارے شعرِ گرہ گیر تک پہنچنا ہے

یہ شورِ ردِ عمل ہے، یہ شورِ ردِ عمل
ہر ایک حلقۂ زنجیر تک پہنچنا ہے

ہمیں جلانا ہیں قیس اور کوہکن سے چراغ
ہمیں وفا کے اساطیر تک پہنچنا ہے

☆

○

تو اک گمان کا مجھ کو یقین اب بھی ہے!
تو گویا وہ میرے دل میں مکین اب بھی ہے!

مری دُعا کی یہ تصویر ہے، یہ میں ہوں، یہ وہ
مجھے قبولِ دُعا پر یقین اب بھی ہے

دیکھ کر مجھے خود پر ترس تو آتا تھا
کہ وہ خلافِ توقّع حسین اب بھی ہے

ہمارے سر پہ کسی آسماں کا ہاتھ نہیں
ہمارے پاؤں میں لیکن زمین اب بھی ہے

☆



غم و آلام خود میں بانٹ لیں ہم
یہ نقدِ خام خود میں بانٹ لیں ہم

یہی لمحے ہیں اپنا کُل اثاثہ!
چلو یہ شام خود میں بانٹ لیں ہم

کوئی کم ہے متاعِ سوزِ ہجراں
سو یہ انعام خود میں بانٹ لیں ہم

یہی الزامِ عشق، انعام بھی ہے
تو یہ الزام خود میں بانٹ لیں ہم





جو اب بھی مرے خون میں یوں گونج رہا ہو
ممکن ہی کہاں ہے وہ مجھے بھول گیا ہو

اب کیا کہوں اس شعر کی قیمت جسے سن کر
اک شعر سی لڑکی نے کہا "پھر سے عطا ہو"

تنہا تو بہرحال بہت رہتے ہو اے دوست
لگتا ہے پشیمان بھی ہو، جب سے جدا ہو!

چھانی ہے بڑی خاک رہِ عشق کی میں نے
تم بھی اسی صحرا کے کوئی آبلہ پا ہو!





مجھے یقیں ہے عدو کی مچان ٹوٹے گی
مچان بچ بھی گئی تو کمان ٹوٹے گی

کہا نہیں تھا؟ کہ آخر کو تھک کے گرتا ہے
کہا نہیں تھا؟ کہ اونچی اڑان ٹوٹے گی

یہ موجِ نغمہ ہستی اٹھے کہ نیچی رہے
مگر یہ طے ہے کہ آخر یہ تان ٹوٹے گی

تمھارے عہدِ محبت پہ استوار ہوں میں
میں ٹوٹ جاؤں گا جب یہ چٹان ٹوٹے گی





اساطیر



لاہور

www.iqbalkalmati.blogspot.com